اُردو افسانے میں مہاجرین کے بنیادی انسانی حقوق کی عکاسی

محسن نواز بسراء

Abstract:

Fundamental Rights are essential human rights that are offered to every citizen irrespective of caste, race, and creed, place of birth, religion or gender. Urdu short stories writers have written many short stories on basic human rights since the beginning of Urdu short stories. While many other people do not get fundamental rights, migrants also face the same problem. Mighrants have to sacrifice their land, property and lives of their beloved ones during migration. The Urdu short story writers who protested against the violation of the fundamental rights of migrants with their pen are covered in this paper.

بنیادی انسانی حقوق وہ ضروری حقوق ہیں جو ہر شہری کو ذات پات، نسل، عقیدہ، جائے پیدائش، مذہب یا جنس کی تفریق سے بالاتر ہو کر برابری کی بنیاد پر میسر ہوتے ہیں۔ کوئی شخص کسی معاشرے میں حقوق کی مکمل ضمانت کے باوجود تب تک ان بنیادی انسانی حقوق سے فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک اسے ایک صحت مند، آزاد معاشرہ اور متحرک زندگی کے بنیادی لوازمات مہیا نہ کیے جائیں۔ بنیادی انسانی حقوق کی جدوجہد انسان صدیوں سے کرتا آرہا ہے۔ رنگ و نسل، امیر و غریب کی تفریق کے خلاف ایک عرصے سے کوششیں جاری ہیں۔ ان میں مکمل طور پر کامیابی تو نہیں ہو سکی لیکن یہ تمام کوششیں آج بلاشبہ انسانوں کے پیدائشی وقار، نسل انسانی میں یکساں اور ناقابل انتقال حقوق کا تسلیم کیا جانا، دُنیا میں آزادی، امن وانصاف اور بنیادی انسانی حقوق کی بالادستی کے امکان کی بنیاد ہیں۔

دُنیا میں جہاں دیگر کئی طبقات کو بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی میسر نہیں آئی اُن میں ایک اہم طبقہ مہاجرین کا ہے۔ مہاجرین کو بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی میں ایک بڑا مسئلہ بدامنی ہوتا ہے کیونکہ ہجرت کے دوران تمام تر انتظامی مشینری اُس طریقے سے کام نہیں کر سکتی جیسے وہ پُرامن ماحول میں کام کر سکتے ہیں۔ پیٹر جیکب لکھتے ہیں: ''انسانی حقوق کی پاسداری کے لیے امن قائم کرنا بنیادی شرط ہے۔'' [1] اِس

وقت دُنیا میں جتنے بھی ادارے کام کر رہے ہیں وہ بلواسطہ یا بلاواسطہ در حقیقت بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی کے لیے ہی کام کر رہے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کے تمام پہلوؤں پر اُردو افسانہ نگاروں نے افسانے لکھ کر بنیادی حقوق کی بازیابی کے لیے اپنا حصہ ڈالا۔ مہاجرین کے مسائل اور اُن کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی اُردو افسانے کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔آغاز انسانیت سے ہی انسانی نقل و حرکت کا سلسلہ جاری ہے۔ ہجرت یا تو جبری عمل سے رونما ہوتی ہے یا پھر رضا کارانہ طور پر۔ اُردو افسانے نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں اوّل الذکر کو موضوع بنایا ہے۔ گزشتہ صدی میں ہندوستان میں دو ہجرتیں اہم ہیں۔ جنھوں نے ادیبوں میں ناسٹیلجیا (NOSTELGIA) کی کیفیت کو جنم دیا۔ اُن میں ۱۹۴۷ء کی تقسیم اور اُس کے بعد 1971ء میں تقسیم بنگال ہے۔ لوگ اوّل الذکر تقسیم میں اپنے پیاروں کی قبریں بھی چھوڑ آئے اور اپنی موت تک تو وہ اسی کرب میں مبتلا رہے کہ اُن سے بچھڑنے والے اُن کے عزیز کہاں اور کس حال میں ہوں گے. جس جگہ وہ پیدا ہوئے وہاں سے بچ کر نکلنا اور یاد ماضی ایک عجیب احساس لیے ہوئے تھا۔ ابھی اس ہجرت کے زخم ہرے ہی تھے کہ تقسیم بنگال کی صورت میں ایک اور ہجرت سر پر آن پڑی۔ جہاں پھر انہیں اپنے پیاروں کی لاشیں لاوارث چھوڑنا پڑیں۔

ہجرت میں جہاں ہر طبقے کو نقصان پہنچا وہیں سب سے زیادہ نقصان خواتین اور بچوں کا ہوا۔ جانیں تو ہر طبقے نے گنوائیں۔ لیکن خواتین کو تو اپنی عزت تک گنوانی پڑی اور اس لوٹ مار میں خواتین کو بیگانوں کے ساتھ اپنوں نے بھی لوٹا۔ ہجرت میں عمومی طور پر بنیادی انسانی حقوق کم میسر آتے ہیں۔ لیکن جس طرح ان دو ہجرتوں میں انسانوں کے بنیادی حقوق سلب کیے گئے وہ کربناک ہیں اور دُکھ اس بات کا ہے کہ جس مقصد کے لیے ہجرت کی گئی وہ وہ بھی حاصل نہ ہوا۔

تقسیم کے وقت جن ادیبوں نے ہجرت کی یا ہجرت کی کربناک صورتِ حال دیکھی وہ ادیب اُس صورتِ حال کو لکھتے رہے۔ ان ادیبوں نے تاریخ کے اس بھیانک موڑ کر اپنے افسانوں میں جگہ دے کر امر کر دیا۔ سید سجاد باقر رضوری رقم طراز ہیں:

> ”۱۹۴۷ء کے بعد ادیب و شاعر یا تو لکھتے رہے، یا لکھنے لگے، یا پھر انہوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ وہ ادیب جو لکھتے رہے۔ اپنے موضوعات اور اسالیب میں راسخ تھے۔ نئے ملک کی تخلیق کو تخلیق شعر کی طرح ماحول، معاشرتی تقاضے اور تاریخ کے جدلیاتی عمل کا

شاخسانہ سمجھتے رہے اور بس لکھتے رہے۔ جو لکھنے لگے۔ انہوں نے برصغیر کی پوری تاریخ کو ذہن میں رکھا۔"2؎

اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اس ہجرت میں پامال ہونے والے بنیادی انسانی حقوق کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مہاجرین کے ساتھ اول ظلم تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر جارہے ہوتے ہیں لیکن دوسرا بڑا ظلم یہ ہوتا ہے کہ اُن مہاجرین کو ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ اُن مہاجرین کے بنیادی انسانی حقوق پر جن افسانہ نگاروں نے آواز بلند کی اُن میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، قدرت اللہ شہاب، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ حسین، انتظار حسین، ممتاز مفتی اور خدیجہ مستور کے نام سرِ فہرست ہیں۔

تقسیم ہندوستان کے وقت جن لوگوں نے ہجرت کی۔ اُن پر ہونے والے ظلم و ستم پر کرشن چندر نے اُن مہاجروں کے بنیادی حقوق پر افسانے رقم کیے۔ اُن کے بعض افسانوں کے تو نام بھی ۱۹۴۷ء میں موجود مختلف اشیاء کے نام پر ہیں۔ جیسے اُن کا افسانہ "پشاور ایکسپریس" اُس کی عمدہ مثال ہے۔ ٹرینوں میں کٹے پھٹے انسانوں کی لاشوں کے مناظر اُن کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ کرشن چندر رقم طراز ہیں:

"وزیر آباد کا اسٹیشن لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ شاید یہ لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ لاشوں کا میلہ، شہر میں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور اسٹیشن کے قریب انگریزی بینڈ کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ اور ہجوم کی پرشور تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آ گیا۔ آگے آگے دیہاتی ناچتے اور گاتے آ رہے تھے۔ اور اُن کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم تھا۔ مادر زاد ننگی عورتیں، بوڑھی، نوجوان بچیاں اور پوتیاں، مائیں اور بہوئیں اور بیٹیاں، کنواریاں اور حاملہ عورتیں ناچتے گاتے ہوئے مردوں کے نرغے میں تھیں۔ عورتیں ہندو اور سکھ تھیں اور مرد مسلمان تھے اور دونوں نے مل کر یہ ہولی منائی تھی۔"3؎

کرشن چندر کا یہ افسانہ تقسیم کے فوری بعد 1949ء میں اُن کے افسانوی مجموعے "ہم وحشی ہیں" میں چھپا۔ ایک تو نیا نیا ہجرت کا زخم تھا اور واقعات کی یادداشت بھی تازہ تھی۔ لوگوں کے دُکھ اور کرب اُن کے ذہنوں پر نقش تھے کہ کیا کیا ہولناکیاں اُن مہاجرین سے کی گئیں۔ اُن مہاجرین کو جہاں قبضے،

جائیدادیں ہتھیانے، مال زیورات چھیننے، عزتیں لوٹنے کی غرض سے قتل کیا گیا۔ وہیں ایک بڑا نعرہ مذہب بھی تھا۔ دونوں طبقے مسلم اور ہندو مہاجرین کو قتل کرنے میں مصروف تھے۔ اُن میں کوئی تفریق نہ تھی کہ یہ فلاں مذہب کا ہے تو یہ پُر امن ہے۔ معاملہ ایسا تھا کہ ایک طویل عرصے سے اکٹھے رہنے والوں نے مذہب کے نام پر تقسیم کے وقت یوں قتل کیے کہ دوسرے مذہب کے افراد کی لاشیں اُن کے دل کو سکوں بخشتیں۔ کرشن چندر لکھتے ہیں:

> ''لیکن اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ اُن کے دل فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی سرحد آگئی تھی۔ ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا اور جب میں امر تسر اسٹیشن پہنچی تو سکھوں کے نعروں نے زمین و آسمان کو گونجا دیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے۔ اور ہندو جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے تھے کوئی شکار ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی مسلمان ہے۔''4

اور دُکھ کی بات تو یہ تھی کہ ان مہاجرین میں ہندو، سکھ، مسلم سب شامل تھے اور ان مہاجرین سے اُن کی زندگی تک کا حق چھیننے والوں میں بھی ہندو، سکھ، مسلم سب شامل تھے اور وہ ایک دوسرے کو اپنے مقتولین کے بدلے کی آگ میں بھی قتل کر رہے تھے۔ ہم اس بنیادی حق تلفی کو آزادی کی جنگ کے نام پر فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ وہ منظر تھے جب انسانوں نے انسانوں سے زندگی کا اولین بنیادی حق بھی چھیننا عبادت اور فرض سمجھ لیا۔ یہ ایک درندگی تھی۔ جسے دونوں طبقات میں سے کوئی بھی کرنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ کرشن چندر لکھتے ہیں:

> ''کیونکہ ابھی ابھی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر جو مسلم مہاجرین کی گاڑی آ کے رُکی تھی اُس میں چار سو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس مسلم عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں۔ اس لیے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکال لی گئیں اور چار سو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔''5

مہاجروں میں ایک تو وہ افراد شامل ہوتے ہیں جو کہ کسی جگہ سے مستقل طور پر سکونت تبدیل کر لیتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مہاجرین بھی شامل ہیں جو کہ ذریعہ معاش کے لیے عارضی ہجرت اختیار کیے ہوئے ہیں اور اُن کی یہ عارضی ہجرت بعض اوقات تو مستقل ہجرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ہجرت کا دُکھ جب بھی سہنا پڑا اُس میں خواتین اور بچوں کو زیادہ کرب برداشت کرنا پڑا۔ اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کے لیے وہ تمام مرد درندے بن جاتے ہیں۔ جن کو عام حالات میں سماجی بندشوں نے جکڑا ہوتا ہے۔ لیکن ہجرت کے دوران اُن کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ عورت پر اپنی ہوس پوری کر سکیں اور اس میں اس بات کی تفریق نہیں ہوتی کہ یہ عورت بیگانی ہے یا اپنی۔ اس ہجرت میں مہاجر عورتوں کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی پر قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ''یا خدا'' ایک عمدہ مثال ہے:

> ''جب کبھی مرد کو وہ دیواریں گرانے کا موقع ملا جو سماجی یا مذہبی قوانین نے عورت کے گرد بنا رکھی ہیں۔ تو عورت بالعموم اسی قسم کے المیہ سے دوچار ہوئی۔ فسادات میں اس قسم کے مواقع مرد کو خوب ملے۔ دل شاد عورت کی مظلومیت کی ایک زندہ کہانی بن کر ''یا خدا'' میں ابھرتی ہے۔ جسے غیروں نے تو اس لیے لوٹا کہ وہ غیر تھی۔ اور اپنوں نے اس لیے لوٹا کہ وہ بے سہارا تھی۔ فساد تو ایک بہانہ تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں ملک ان مردوں کے تھے۔ جنہوں نے شرافت کے نقلی پردے پھاڑ کر محض عورت کے ننگے جسم کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔'' [۶]

ہجرت کر کے آئی ہوئی عورت پاکستان میں بھی محفوظ نہیں رہی۔ جہاں وہ اس لئے ہجرت کر کے آئی کہ اُسے بنیادی حقوق ملیں گے۔ کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے گا۔ لیکن یہاں بھی اُس مہاجر عورت کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

> ''تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک امیر انسان ہوں۔ میں کچھ روز کے لیے تمہیں ملکہ بنا کر رکھوں گا۔ تمہارا رحیم خان معلوم نہیں کہاں کھو گیا ہے۔ شاید وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم فرضی ہستی کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ۔ میری جان آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اب تم اپنے آزاد وطن میں آئی ہو.....اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں یہ ہمارا وطن ہے۔ پاکستان زندہ باد پاکستان پائندہ باد۔'' [۷]

مہاجر خواتین کا بنیادی حق تھا کہ اُن کی عزتوں پر ہاتھ صاف نہ کیا جائے۔ اُن سے جبراً شادیاں نہ کی جائیں۔ اُن کے جبراً مذہب تبدیل نہ کروائے جاتے۔ لیکن بنیادی حقوق کی یہ تمام خلاف ورزیاں ۱۹۴۷ء کی ہجرت میں کی گئیں۔ لیکن اُردو افسانہ نگاروں نے اپنی ذمہ داری پوری کیں اور بغیر کسی تفریق کے لکھا۔ چاہے اُنہیں قلم اپنوں کے ہی خلاف کیوں نہ اُٹھانا پڑا اور چاہے اُنہیں اس ضمن میں مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔

سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' اسی تلخ تجربے کا نوحہ بیان کرتا ہے۔ منٹو کو اس افسانے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ یہ انہوں نے اپنے ہی پاکستانی رضا کاروں کے خلاف قلم کیوں اُٹھالیا۔ اُن کو عدالتوں کا کرنا پڑا۔

سراج الدین جو کہ ہجرت میں اپنی بیٹی سکینہ کو بھی کھو چکا تھا۔ اُسے ڈھونڈنے کے لیے پاکستان میں موجود رضا کاروں کو اپنی بیٹی کا حلیہ بیان کرتا ہے۔ جب اُس کی بیٹی اُن رضا کاروں کو ملتی ہے۔ تو وہ اس ہجرت کی ماری لڑکی کو باپ کے حوالے کرنے کی بجائے، اجتماعی زیادتی کا نشانہ بناتے ہیں اور پھر نیم مردہ حالت میں پھینک دیتے ہیں۔

مہاجرین کے حقوق پر یوں تو کئی افسانہ نگاروں نے افسانے رقم کیے ہیں۔ لیکن کرشن چندر اور منٹو اُن میں سر فہرست ہیں۔ انہوں نے جس طرز پر عدل کا ترازو پکڑ کر اپنے ہم مذہبوں کے خلاف بھی انصاف سے لکھا ہے۔ وہ بنیادی حقوق کی آواز کو تقویت بخشتا ہے۔ منٹو نے لافانی افسانہ ''کھول دو'' لکھ کر اس بات سے پردہ چاک کیا کہ مہاجروں پر ظلم صرف دشمن نے نہیں بلکہ اُن کے اپنے گھر والوں نے بھی کیے ہیں:

> ''آٹھ رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی اسے کھانا کھلایا دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا۔۔ کئی دن گزر گئے سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی......ایک روز سراج الدین نے کیمپ میں ان نوجوان رضاکاروں کو دیکھا لاری میں بیٹھے تھے۔ سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا۔ بیٹا میری سکینہ کا پتہ چلا؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ چل جائے گا، چل جائے گا اور لاری چلا دی..... شام کے قریب کیمپ میں جہاں سراج الدین بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی کچھ گڑ بڑ ہوئی چار آدمی کچھ اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بے ہوش پڑی تھی۔''[۸]

منٹو نے اُن رضا کاروں کے خلاف لکھا جو کہ رہبر کی شکل میں رہزن تھے۔ منٹو نے جہاں مہاجرین کے بنیادی حق پر لکھا ہے۔ وہیں اُن لوگوں کے حق میں بھی لکھا ہے کہ جو لوگ ہجرت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کو جبراً سرکاری مشینری کے ذریعے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا، حالانکہ ہر فرد کا بنیادی حق

ہے کہ اُسے اُس کے خطے سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب کسی کی شہریت تبدیل نہیں کرتا۔ اگر کوئی برطانیہ کا گورا اپنا مذہب تبدیل کر لیتا ہے تو مذہب تبدیل کرنے کے بعد بھی وہ برطانوی شہری ہی رہے گا۔ لیکن یہاں ۱۹۴۷ء میں لوگوں کو مذاہب کی بنیاد پر جبراً ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ اس بنیادی حق تلفی پر منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ۱۹۵۴ء میں اُن کے افسانوی مجموعے ''پھندنے'' میں شائع ہوا۔

> ''بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ، پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں۔ انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔'' ۹

اس کا اثر کئی پاگلوں پر تو بہت زیادہ ہوا وہ سوچ رہے تھے کہ کیسے ممکن ہے کہ اُن کو اُن کے شہروں سے نکال دیا جائے۔ وہ حیران تھے کہ وہ پہلے تو ہندوستان میں تھے اب وہ جگہ پاکستان ہے تو پھر ہندوستان کہاں ہے۔ اُن کا شہر اب کہاں ہے۔ منٹو اس کا منظر بیان کرتے ہیں:

> ''اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔ ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا متاثر ہوا کہ وہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا۔ جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا، ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔ میں اس درخت پر رہوں گا۔'' ۱۰

یہی صورتِ حال بشن سنگھ کی تھی جو کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا زمیندار تھا۔ لیکن پاگل ہو گیا تھا۔ اُس کے گھر والے ہر مہینے اُسے ملنے آتے تو وہ اُن کے لیے تیار ہوتا۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے اُس کے گھر والے نہ آ رہے تھے۔ کیونکہ وہ ہندوستان ہجرت کر چکے تھے۔ وہ اک عرصے سے اپنے سوجے ہوئے پاؤں پر مسلسل کھڑا تھا۔ جب اس کو زبردستی ہندوستان بھیجنے لگے تو بشن سنگھ بارڈر پر درمیان میں اس انداز سے کھڑا ہو گیا کہ اب کوئی طاقت اسے وہاں سے ہٹا نہیں سکتی اور نہ ہی جبراً ہجرت پر مجبور کر سکتی ہے۔

''سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خار دار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔''۱۱

دُکھ کی بات تو یہ تھی کہ لوگوں نے جس مقصد کے لیے ہجرت کی یا انہیں کروائی گئی اب وہ آزاد ہوں گے انہیں خوش حالی ملے گی، عزت ملے گی، مذہب کی آزادی ملے گی، وہ اُس طرح نہ ملی جس طرح ملنے کا حق تھا۔ مہاجروں کا اولین حق تھا کہ عالمی ادارے اور مقامی انتظامیہ انہیں بھوک سے بچاتے، خوراک فراہم کرتے، رہائش دیتے، اُن کی عصمتوں کی حفاظت کرتے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم اس ضمن میں لکھتی ہیں:

''مہاجرین نئے وطن میں خوشحالی، سکون اور محبت کے خواب لے کر آئے تھے۔ لیکن جب وہ لٹے پٹے پاکستان پہنچے تو مسائل کے انبار انہیں نگلنے کے لیے تیار نظر آئے۔ قاسمی کا افسانہ ''تسکین'' اسی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے میں ہجرت کو موضوع بناتے ہوئے کسمپرسی اور مہاجر کیمپوں کی منتظمین کی بے حسی کو بیان کیا گیا ہے۔ مہاجر کیمپوں میں بچے موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ کہیں غذا کی تلاش میں بوڑھوں کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ کہیں مہاجرین اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی تلاش میں انتظار کی سولی پر لٹک رہے تھے۔ کہیں اپنے چاہنے والوں کی لاشوں، انتڑیوں اور لٹی ہوئی عصمتوں کے مناظر مہاجرین کا چین لوٹ رہے تھے۔''۱۲

ہجرت میں جس طبقے کو سب سے زیادہ ظلم و بربریت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ طبقہ خواتین کا ہے۔ مردوں کو تو ہجرت میں زیادہ سے زیادہ جان کا ڈر ہوتا ہے اور دشمن کے افراد سے خوف ہوتا ہے۔ لیکن خواتین کو اس بات کا زیادہ ڈر ہوتا ہے کہ انہیں عفت سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور کوئی اُن کو اپنی تسکین کے لیے مستقل طور پر اپنے پاس بھی رکھ سکتا ہے۔ خواتین مہاجروں کو صرف دشمنوں سے ڈر نہیں ہوتا۔ اُن کو اپنے لوگوں کی درندگی کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ تقسیم ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ یہ ظلم عام رہا۔ اس میں کسی مخصوص طبقہ کو دوش نہیں دیا جا سکتا۔ ہندو نے ہندو عورتیں اور مسلم نے مسلم عورتوں تک کا استحصال کیا اور دکھ کی بات یہ زیادتی کا شکار خواتین کو ان کے اپنوں نے بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ رابعہ الرباء لکھتی ہیں:

"۱۹۴۷ء میں تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کا سانحہ پیش آیا۔ جس میں چالیس ہزار سے زائد خواتین اغوا ہوئیں۔ ہزارہا قتل و گم ہوئیں کئی دارلامان پہنچ گئیں تو کوئی بھکارن بن گئی۔ کچھ بچ کر اپنے اقرباء کے پاس پہنچ گئیں لیکن انہیں گھر والوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد سماج میں کچھ نئے رویے نمودار ہونے لگے۔ ادب نہ صرف سماج کا عکاس ہوتا ہے بلکہ سماج کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اُردو ادب نے بھی سماج کی ترجمانی کی ہے۔ اُردو افسانہ نگاروں نے معاشرے کے ان مسائل کو ابتدا سے ہی اپنا موضوع بنایا اور آج تک یہ موضوع جاری و ساری ہے۔ کیونکہ معاشرے میں یہ تفریق جاری و ساری ہے۔"۱۳

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "لاجونتی" اک ایسی مہاجر عورت کے کرب پر مبنی ہے۔ جس کو تقسیم کے دوران اغوا کر لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی جاتی ہے۔ تقسیم کا دُکھ تو ہر فرد کے لیے کرب ناک تھا۔ لیکن اُن عورتوں کے لیے تقسیم کے ساتھ ساتھ یہ اذیت بھی تھی کہ اُن کو تقسیم کے دوران اغوا کر لیا گیا اور اس اغوا کے بعد اُن عورتوں کو قابلِ رحم سمجھا گیا۔ اُن کو وہ عزت اور محبت نہیں دی گئی جو انہیں اغوا ہونے سے قبل میسر تھی۔ لاجونتی بھی اک ایسی ہی اغوا شدہ عورت ہے۔ جسے اس کا شوہر سندر لال پاکستان سے ہندوستان آنے کے بعد اپنا تو لیتا ہے۔ لیکن وہ اُس سے ایسا رویہ رکھتا ہے کہ لاجونتی کو لگتا ہے کہ وہ اسے قابلِ رحم سمجھ کر ٹوکتا نہیں۔ اُس سے وہ پرانا برتاؤ نہیں رکھ رہا جو کہ اغوا ہونے کے بعد سے پہلے برتاؤ تھا۔

وہ پرانا سندر لال چاہتی تھی۔ لیکن سندر لال اپنی لاجونتی کے اغوا ہونے کے بعد یہ عہد کر چکا تھا کہ جب وہ واپس آئے گی تو وہ اس سے لڑائی نہیں کرے گا جب مغویہ مہاجر عورتیں واپس آئیں تو کئی لوگوں نے انہیں لینے سے انکار کر دیا کہ یہ اب جوٹھی ہو گئی ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں:

"مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں، ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان لے لی۔ لیکن انہیں کیا پتا کہ وہ

زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں اور کس طرح پتھرائی ہوئی نگاہوں سے وہ موت کو گھور رہی ہیں۔ اس دُنیا میں جہاں اُن کے شوہر تک اُن کو نہیں پہچانتے۔"۱۴

یہاں مسائل بس یہیں تک محدود نہ رہے۔ مہاجر عورتوں کو اُن کے مذہب کے لوگوں نے بھی صرف اُس صورت قبول کیا۔ جب وہ خوبصورت اور جوان ہوں۔ اُن مہاجر عورتوں کا تبادلہ سرحد پر اس طرح ہوا جس طرح جانوروں یا کسی اور جنس کا تبادلہ کیا جاتا ہے کہ جس مقدار میں کوئی جنس کسی کو دی جائے۔ اُسی مقدار میں واپس ملے۔ یہی عالم مہاجر خواتین کا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی رقم طراز ہیں:

"واہگے پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اُس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں۔ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ، بوڑھی اور بے کار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازعے پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت اُدھر کے والنٹیروں نے لاجو بھابھی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو دیکھو جتنی لڑکیاں تم نے دی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟ اور وہاں لاجو بھابھی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندوے چھپا رہی تھی۔ پھر جھگڑا ہو گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا مال واپس لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا لاجو......لاجو بھابھی۔ مگر شور مچانے پر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کر بھگا دیا۔"۱۵

ہجرت کا کرب انتظار حسین کے افسانوں کا بھی موضوع رہا ہے۔ وہ اس بات سے بخوبی آشنا تھے کہ ہجرت اور اپنا علاقہ چھوڑنے کا کیا کرب ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں سے انتظار حسین جڑے تھے اور ترقی پسند انتظار حسین سے۔ انتظار حسین نے سقوط مشرقی پاکستان کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اُن کے افسانوں پر ڈاکٹر انوار احمد رقم طراز ہیں:

"انتظار حسین ہمارے اُن عظیم افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو اپنے عہد کی گواہی دے رہے ہیں۔ انتظار حسین کے مجموعے "شہر افسوس" میں یہ گواہی اجتماعی دُکھ میں شرکت کی مخلصانہ آرزو سے معتبر ہوئی ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان یا قیام بنگلہ دیش ہماری قومی تاریخ کا سب سے المناک سانحہ ہے۔ اس سانحے کو بے خبری اور بے دردی نے اور بھی پیچیدہ المیہ بنا دیا۔ انتظار حسین نے اس سانحہ پر لازوال افسانہ "شہر

> افسوس" لکھا۔ انسانی سطح پر اس المیے کی کئی جہتیں ہیں۔ پہلے مقتدر بھائی کی جانب سے اپنے بے اختیار یا ادنیٰ بھائی کے گھر میں آبرو ریزی (اپنی بہن کی) قتل و غارت (اپنے گھر میں) پھر غیروں کے کندھے پر سوار ہو کر بپھرے ہوئے بھائی کی جانب سے پسپا ہوتے بھائی کی بہن (اپنی بہن) کی عصمت دری اس کے گھر (اپنے گھر) میں لوٹ مار اور قتل و غارت تقسیم ہند کے موقع پر بہار، نواکھالی، کلکتہ اور آسام وغیرہ سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں گھر بنانے والوں کی بے گھری، جوشِ انتقام کے ہاتھوں سارا اور پامال ہوتا ہوا اجتماعی وجود، دشمنوں کی طرف سے امان کا فریب اور نجات کے مسدود راستے انتظار حسین اس اذیت ناک تجربے کو کوفہ و کربلا کی اذیت گاہوں سے گزار کر اپنے مخصوص داستانوی اسلوب کے ساتھ "شہر افسوس" جیسا افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔"[۱۶]

انتظار حسین ہجرت کے ماروں کا کرب جس شدت سے بیان کرتے ہیں۔ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اُس ہجرت میں شامل تھا۔ مہاجروں کے بنیادی حقوق پر انتظار حسین کا "شہر افسوس" وہ واقعات بھی بیان کر دیتا ہے جن کو بیان کرنے سے کئی افسانہ نگار اُس طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ جس طرح انتظار حسین نے منظر کشی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین اُس ہجرت میں خود شامل ہوں۔ جب مہاجروں کو طاقتوروں نے تلوار کی نوک پر اتنا مجبور کیا کہ ایک بھائی کو تلوار اور زندگی کے چھین جانے کے ڈر نے اتنا مجبور کیا کہ اُس نے دشمن کے ڈر سے اپنی حقیقی بہن کو برہنہ کر دیا۔ ایک بوڑھے کو اس قدر ڈرایا گیا کہ وہ اپنی بہو کے کپڑے اُتارے اور انہوں نے بوڑھے شخص سے اپنی منشاء کے مطابق یہ کروایا۔ انتظار حسین اُن مہاجروں کے بنیادی حقوق کے چھین جانے کا کرب یوں بیان کرتے ہیں:

> "یہ تیری کون ہے۔ بولا کہ یہ میری بہن ہے۔ میں نے کہا کہ تو اسے برہنہ کر! یہ سنا تو لڑکی پہ دہشت طاری ہوئی۔ بدن مثل بید کے لرزنے لگا۔ نوجوان نے فریاد کی کہ ایسا مت کہہ کہ یہ میری بہن ہے۔ مجھ پہ بھی وحشت سوار تھی۔ میں نے نیام سے تلوار نکال لی اور چلایا کہ تو اسے برہنہ کر! برہنہ تلوار کو دیکھ کر نوجوان خوف سے تھرایا، پھر ایک تامل کے ساتھ اس کے لرزتے ہاتھ بہن کی ساڑھی کی طرف بڑھے۔"[۱۷]

''دہشت میں بھاگتی ہوئی ایک برقعہ پوش کو اس نے دبوچ رکھا تھا۔ ایک بوڑھے آدمی نے زاری کی اور چلایا کہ اے جوان! ہماری آبرو پہ رحم کر! سانوے نوجوان نے لال پیلی نظروں سے اُسے دیکھا اور پوچھا: یہ تیری کون ہے۔ وہ بوڑھا بولا کہ بیٹے! یہ میری بہو ہے۔ اس پر سانولے نوجوان نے دانت کچکچائے اور چلایا کہ بوڑھے! تو اسے برہنہ کر! یہ سننا تھا کہ وہ لرزرتا کانپتا بوڑھا آدمی ایک دم سے سُن ہو گیا۔''[۱۸]

''یہ تیری کون ہے؟ میں نے تامل کیا، آخر بتایا کہ یہ میری بیٹی ہے۔ سانولے نوجوان نے شقی القلب بن کر کہا۔ پھر تو اسے برہنہ کر۔ یہ سن کر خوف سے اس معصوم کی گھگی بندھ گئی اور ادھر میں ڈھے گیا اور۔''[۱۹]

انتظار حسین نے ''شہر افسوس'' میں اُن تمام ظالم کرداروں سے نفرت و کراہت کا اظہار کیا ہے اور اُن کے منہ پر تھوکا ہے۔ جنھوں نے تقسیم کے وقت مہاجروں کے حقوق چھیننے، اُن کی عزتیں پامال کیں اور اُن کو زندگی بھر، زندگی کا بوجھ اُٹھانے کی بددعا دی۔

انتظار حسین نے اس کرب کو بیان کیا کہ ابھی ۱۹۴۷ء کی تقسیم میں مہاجروں کے ساتھ ہونے والے مظالم کے زخم ہرے تھے کہ اُن پر دوسری ہجرت بنگلہ دیش کی علیحدگی کی صورت میں مسلط کر دی گئی۔ وہ اس کرب کو بیان کرتے ہیں۔ پہلی ہجرت میں تو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی قبریں اپنے ہی ملک میں چھوڑ کر ہجرت کی۔ لیکن اس دوسری ہجرت میں انہیں اپنے بزرگوں کی لاوارث لاشیں بھی چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی اور لاشیں بھی اُن پیاروں کی چھوڑنا پڑیں، جنہوں نے انہیں پالا اور اُن کی ہر خوشی کا خیال رکھا۔ یہ ہر شخص کا بنیادی انسانی حق ہے کہ اُس کو اُس کے اپنے ہی خطے سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مذہب تبدیل کرنے سے کسی بھی قانون میں شہریت تبدیل نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں تو اس جبر سے اپنے علاقے سے بے دخل کیا گیا کہ لوگوں کو یہ بھی حق نہ رہا کہ وہ اپنے باپ کی لاش کو ہی ساتھ لے آئیں۔ انتظار حسین ''شہر افسوس'' میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے بوڑھے باپ اپنے جوان بیٹوں سے زیادہ غیرت مند تھے اور ہم نے اُن کے ساتھ کیا کیا میں اپنے مسخ شہرے والی لاش لے کر یہاں آ گیا اور اپنے باپ کی لاش وہیں چھوڑ آیا۔

دوسرا آدمی یہ سن کر چونکا اور بولا: مجھے تو خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں بھی اپنے باپ کی لاش وہیں چھوڑ آیا۔

تیسرا آدمی تلخی سے ہنسا اور کہنے لگے: آگے جب ہم نکلے تھے تو اپنے آباؤ واجداد کی قبریں چھوڑ آئے تھے۔ اب کے نکلے ہیں تو اپنی لاشیں چھوڑ آئے ہیں۔"۲۰

انتظار حسین نے زندگی کے مسائل لکھے ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو لاحق پریشانیاں اور جدید عہد میں اشرف المخلوقات کی بے توقیری کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بنیادی انسانی حقوق کی بات کی ہے۔ جہاں انسانی بے توقیری کی بات ہو گی۔ وہ درحقیقت بنیادی انسانی حقوق کی بات ہو گی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد انسانوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں۔ اُن کا ذکر انتظار حسین کے افسانوں میں کئی رنگ کے موضوعات میں علامتی روپ لیے پنہاں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سعادت سعید رقم طراز ہیں:

"انتظار حسین کی قابل فہم علامات نے انہیں قارئین کے وسیع حلقے سے متعارف کروایا۔ ان کی ماضی دوستی حال کے لمحوں کی شناخت کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے انسانی زندگی کی توقیر کی کتھائیں لکھیں۔ ان کے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں میں پاکستان بننے کے بعد کے کئی مسائل و معاملات اور منظر منعکس ہوئے۔ ان کی تخلیقات میں انسانی حوالوں سے اُن کے دردمند دل کی صدائیں رقم ہوئیں۔"۲۱

ہجرت میں ہونے والے مظالم اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی پر اُردو افسانے نگاروں نے آواز بلند کی اور قارئین تک وہ تمام حق تلفیاں پہنچائیں جو کہ مہاجروں کا نصیب ٹھہریں۔ انتظار حسین نے بتایا کہ اپنی زمین سے اکھڑے ہوئے لوگوں کے لیے کہیں جائے پناہ نہیں۔ کرشن چندر نے اپنے افسانے "جانور" میں بتایا کہ سب کچھ لٹنے کے بعد لوگ کس طرح نفسیاتی مریض بن گئے۔ جن کے پیاروں سے اُن کا زندہ رہنے کا بنیادی انسانی حق ہی چھین لیا گیا۔ اُردو افسانہ نگاروں نے اِن بنیادی حق تلفیوں پر آنکھ بند کرنے کی بجائے اِن پر کھل کر لکھا ہے۔ بنیادی انسانی حقوق پر جہاں دیگر کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ وہیں اُردو افسانہ نگاروں نے بھی اِن حقوق کی بازیابی کے لیے اُردو افسانے کے آغاز سے ہی اپنے قلم سے کام لیا تا کہ انسانوں کو اُن کے بنیادی انسانی حقوق میسر آسکیں جو کہ اُن کا پیدائشی حق ہے۔

حواشی:

1۔ پیٹر جیکب،انسانی حقوق کا ارتقاء،(لاہور:سانجھ پبلی کیشنز، 2013ء)،ص56

2۔ سجاد باقر رضوی، سید، ڈاکٹر، ''دیباچہ''، مشمولہ آخری آدمی، مجموعہ انتظار حسین، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۲۰ء)،ص ۳۶۷

3۔ کرشن چندر، ''پشاور ایکسپریس''، مشمولہ ہم وحشی ہیں، (بمبئی: کتاب پبلشرز، ۱۹۴۹ء)، ص۵۷

4۔ ایضاً،ص ۵۸ 5۔ ایضاً

6۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۹ء)، ص۴۷۸

7۔ قدرت اللہ شہاب، ''یا خدا''، مشمولہ سُرخ فیتہ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص۵۲

8۔ سعادت حسن منٹو، ''کھول دو''، مشمولہ کلیات منٹو (جلد دوم)، مرتب: امجد طفیل، (اسلام آباد: نیر یٹوز،۲۰۱۲ء)،ص ۳۲۲۔۳۲۳

9۔ سعادت حسن منٹو، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، مشمولہ کلیات منٹو (جلد دوم)، مرتب: امجد طفیل، (اسلام آباد: نیر یٹوز،۲۰۱۲ء)،ص۵۶۳

10۔ ایضاً،ص۵۶۴ 11۔ ایضاً،ص۵۶۸

12۔ فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات،(اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع دوم، مئی ۲۰۱۰ء)،ص۳۰۷

13۔ رابعہ الربا،احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں نسائیت،(لاہور: دستاویز،۲۰۱۶ء)،ص ۱۹

14۔ راجندر سنگھ بیدی، ''لاجونتی''، مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، مرتب: صلاح الدین محمود، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،ص۵۹۴

15۔ ایضاً،ص ۵۹۸۔۵۹۹

16۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''انتظار حسین: فکر و فن''، مشمولہ انتظار حسین تنقیدی جائزہ مکالمہ اور زندگی نامہ، مولف: محمد عاصم بٹ، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)،ص۱۳۵

17۔ انتظار حسین، ’’شہر افسوس‘‘، مشمولہ شہر افسوس، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص۲۰۹

18۔ ایضاً، ص۲۱۰   19۔ ایضاً، ص۲۱۱

20۔ ایضاً، ص۲۲۰

21۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ’’انتظار حسین کی ادبی تنقید اور علامتی زوال کی حکایت‘‘، مشمولہ انتظار حسین تنقیدی جائزہ مکالمہ اور زندگی نامہ، مولف: محمد عاصم بٹ، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص۱۱۳

ماخذ:

1۔ انتظار حسین، شہر افسوس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

2۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء

3۔ پیٹر جیکب، انسانی حقوق کا ارتقاء، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، 2013ء

4۔ رابعہ الربا، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں نسائیت، لاہور: دستاویز، ۲۰۱۶ء

5۔ راجندر سنگھ بیدی، مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، مرتب: صلاح الدین محمود، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

6۔ سعادت حسن منٹو، کلیات منٹو (جلد دوم)، مرتب: امجد طفیل، اسلام آباد: نیریٹوز، ۲۰۱۲ء

7۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۹ء

8۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع دوم، مئی ۲۰۱۰ء

9۔ قدرت اللہ شہاب، ’’یاخدا‘‘، مشمولہ سُرخ فیتہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

10۔ کرشن چندر، ہم وحشی ہیں، بمبئی: کتاب پبلشرز، ۱۹۴۹ء

11۔ محمد عاصم بٹ (مولف)، انتظار حسین تنقیدی جائزہ مکالمہ اور زندگی نامہ، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء